© rasailojaraid.com



# انتقاد

**"برِعظیم پاک و ہند کی ملتِ اسلامیہ":-** مصنف ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی (وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی)، مترجم ہلال احمد زبیری۔

ناشر: شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ کراچی یونیورسٹی، کراچی۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب کی یہ معرکہ آرا کتاب انگریزی میں ہے، اور اسے بڑے اہتمام سے نہایت ہی عمدہ ادبی اسلوب اور بڑی صاف و شستہ زبان میں اُردو میں منتقل کیا گیا ہے۔ ترجمہ بڑا رواں ہے اور پڑھتے وقت محسوس نہیں ہوتا کہ اصل کتاب انگریزی میں ہے۔ اور یہ اُس کا ترجمہ ہے۔

فاضل مصنف نے جو ہندوستان میں اسلامی عہد کے مانے ہوئے مورّخ ہیں، برِعظیم پاک و ہند کی ملّتِ اسلامیہ کی یہ سرگزشت ایک خاص نقطۂ نظر سے لکھی ہے، جسے ہم آسانی سے ایک پاکستانی عالم و محقق کا نقطۂ نظر کہہ سکتے ہیں۔ یعنی موصوف کی رائے میں اس برِعظیم میں اسلام نے ایک ملّت کی تشکیل کی، جس کا شروع ہی سے مجموعی ہند میں اپنا ایک منفرد اور ممتاز وجود تھا، اور جب اس مجموعی ہند کو خود اپنے اوپر حکومت کرنے کے جمہوری اختیارات ملے تو اس وجود کا پاکستان کی شکل میں ہندوستان سے الگ ایک مستقل مملکت میں برسرِ کار آنا گزشتہ طویل تاریخ کا فطری اور منطقی نتیجہ تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے "دیباچہ" میں لکھا ہے کہ برِعظیم میں ملّتِ اسلامیہ کی اس حیثیت کو اس طرح نہ سمجھنے کا ہی نتیجہ ہے کہ آج ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ناخوشگوار تعلقات کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ خود اُن کے الفاظ میں:-

"جب قوم پرستی نے برِعظیم کے باشندوں کے دلوں کو گرمانا شروع کیا تو اسے ایک مسلّم امر سمجھا لیا گیا کہ چوں کہ یہ باشندے سب ایک ہی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



مشترک وطن میں آباد ہیں، اس لئے وہ قومی اتحاد کے یکساں خواہش مند ہوں گے۔ مسلمانوں سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ ایک مذہبی اقلیت کے کردار پر سعادت مندی کے ساتھ راضی ہو جائیں گے؛ اور باقی تمام اُمور میں ہندوستانی قوم سے کامل یگانگت پیدا کر لیں گے۔ اس قسم کی اُمیدیں مُسلم ملّت کی نفسیات، اس کے رہنماؤں اور عوام کے تفکر، اور اُس کے ماخذوں، اُس کے نشوونما اور اُس کی سالمیت کی تاریخ سے انتہائی افسوس ناک ناواقفیت پر تعمیر کی گئی ہیں۔ جب تاریخ کے تقاضے پورے ہوئے اور مسلمانوں نے ایک قوم ہونے کا دعویٰ کیا تو بہت سے لوگ حیران رہ گئے اور بعض کو تو ایسا دھچکا بھی لگا کہ گویا کوئی خلافِ اخلاق و انسانیت بات کہہ دی گئی ہے۔"

اس میں شک نہیں کہ برِّعظیم میں "قوم پرستوں" نے ایک مدت تک "قوم" اور "وطن" کے تصورات کو جن معنوں میں نشوونما دی اور اُنھیں پروان چڑھایا تھا، جب مسلمانوں نے ایک قوم ہونے کا دعویٰ کیا تو واقعی اُن کو شدید دھچکا لگا، اور وہ اب تک اس سے سنبھل نہیں پائے۔ اس ضمن میں مصنف کا یہ ارشاد بالکل صحیح ہے کہ

"اگر ان عوامل کی پہلے سے مناسب تشخیص کر لی گئی ہوتی اور اگر اتنے طویل عرصے تک اُن کے مطالبے کو نظر انداز نہ کیا گیا ہوتا تو اُن کے حل زیادہ صلح و آشتی کے ساتھ دریافت کر لئے جاتے اور ہندوستان و پاکستان کی پشتوں پر تلخی و مخاصمت کے انتہائی خوف ناک ورثے کا وہ چار جامہ نہ کسا گیا ہوتا جو اُن کے نشوو ارتقا کو روکتا ہے اور اُن کے مطمحِ نظر کو خراب کرتا ہے۔"

غرض یہ ہے وہ اساسی نقطۂ نظر جس کے تحت یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ چنانچہ بقول مصنف "ان صفحات میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ مُسلم ملّت کے ان فکری سانچوں کی تاریخ کا سراغ لگایا جائے، جن کی تشکیل اُس کی مخصوص صورتِ حال کے نتیجے میں ہوئی تھی اور جنہوں نے اس کے مقدر اور اس کی سالمیت کے متعلق تصورات کو اپنے اندر ڈھالا تھا۔"

کتاب کے ابتدائی ابواب میں برِّعظیم میں اسلام کے داخلے، اس کے استقرار و توسیع اور پھر اُ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



تیجے میں کس طرح سالمیتِ ملت کی طرف اقدام کیا گیا، اُس پر بحث ہے، پھر اکبر کا دَور آتا ہے جس پر زا عتقادی کا زور" کے باب میں محاکمہ ہے۔ پھر حضرت مجدد الف ثانیؒ، اورنگ زیب عالمگیرؒ اور رت شاہ ولی اللہؒ اور اُن کے متبعین کی اصلاحی کوششوں کا ذکر ہے۔ اس کے بعد زوال کا دَور ہے۔ زوال کے بعد ملت نے جس طرح سنبھالا لیا، اُس پر بحث کی گئی ہے "مسلم قومیت کا ظہور" کا ب جو کتاب کا آخری باب ہے، یوں اختتام پذیر ہوتا ہے:-

"تحریکِ پاکستان کی ترقی کا مشاہدہ کرنے والے اس پر حیران تھے کہ مسلمانوں میں یہ خیال کس قدر سرعت سے پھیل گیا اور جیسے ہی کہ برِعظیم میں ایک آزاد مسلم مملکت کا قیام ممکن العمل نظر آنے لگا، مقصد پاکستان کے ساتھ جذباتی و ہیجانی تعلق کی شدّت بھی ترقی کر گئی"۔

فاضل مصنف کے نزدیک اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ "جب سے ملت نے اپنے سیاسی اقتدار کو مویا تھا، اُس وقت سے ایک مسلم حکومت کی خواہش اُس کے شعور میں گہری جڑیں پکڑے ہوئے تھی": دربقول مصنف اس مسئلے کا منفی پہلو بھی تھا۔ اور وہ تھا ہندوؤں اور مسلمانوں کا تاریخی کردار، اس تمام مانے میں اُن کا ایک دوسرے سے معاشرتی اور ذہنی بُعد اور اُن میں کسی قسم کے تاریخی اشتراک کا لدم احساس۔

ڈاکٹر صاحب نے یہ سب کچھ ایک پُرمغز و پُرمعنی جملے میں یوں ادا کر دیا ہے:-

"پاکستان کے تصوّر سے متعلق مسلم ملت کا طرزِ عمل اس کی تاریخ کا ایک منطقی نتیجہ تھا"۔

برِعظیم میں اسلام سب سے پہلے اُس کے جنوب میں داخل ہوا، مصنف نے اس پر بڑی تفصیل سے بحث کی ہے، اور لکھا ہے کہ اگرچہ جنوبی ہند میں اسلام کو بنگال کی طرح کامیابی نہیں ہوئی لیکن ہندو مذہب میں اس کے بعد جو اصلاحی تحریکات شروع ہوئیں، وہ اسلام کے اثرات کا نتیجہ تھیں۔ اس بارے میں ہوں نے یورپی اہلِ قلم اور ڈاکٹر تارا چند کے حوالے دیتے ہیں۔ اِن ہندو مصلحین میں سب سے اوّل نمبر شنکرا چاریہ ہیں۔ ایک یورپی اہلِ قلم کے الفاظ میں "........... اوائل عمر میں شنکر کا رابطہ اسلام سے تھا اور اس نے اسلام کا اثر قبول کیا تھا....."

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



ہندو مذہب کی اصلاح کی یہ تحریک جنوب سے شمال پہنچی، اور بعد میں یہی محرک بنی اُن مذہبی تحریکوں کا جن سے مختلف ہندو گروہوں کا سیاسی شعور اُبھرا۔ مصنف کے الفاظ میں "........اس حقیقت سے انکار کرنا دشوار ہے کہ اسلام نے ہندو فکر کی اصلاح و ترمیم اور اس کے نشوونما میں ایک اہم کردار ادا کیا....." لیکن "دو قابلِ لحاظ اُمور" کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب کو اسلام کی "اس کامیابی کی عظمت" سے انکار ہے "اولاً یہ کہ اسلام کے پیشِ نظر یہ مقصد کبھی نہیں رہا تھا کہ وہ دوسری ثقافتوں پر اثر ڈال کر اُن کی اصلاح کرے اور ثانیاً یہ کہ اس کامیابی سے خود اُس کے لئے سخت مشکلات پیدا ہو گئیں۔"

جہاں تک بقول موصوف "خود اُس کے لئے" ——— زیادہ صحیح یہ تھا کہ وہ اُس یعنی اسلام کے بجائے مسلمانوں کے لئے کہتے ——— "سخت مشکلات پیدا" ہونے کا سوال تھا، یہ تاریخ کا ایک فطری تقاضا ہے، اور جب سے تاریخِ انسانی کی ابتدا ہوئی ہے، محکوم قومیں حاکم قوموں کے تحت آکر ان سے کچھ سیکھتیں اور بعد میں اُن سے آزاد ہو جاتی ہیں۔ خود اس برِعظیم میں برطانوی تسلط کے خلاف سب سے پہلے وہ اُٹھے جو برطانوی تعلیم و روایات سے بہرہ مند ہو چکے تھے۔ اگر مسلمانوں کے معاملہ میں ایسا ہوا، تو یہ عین فطری تھا۔ اور فطرت کا عمل سب کے ساتھ یکساں ہوتا ہے۔

باقی رہا مصنف کا یہ ارشاد "کہ اسلام کے پیشِ نظر یہ مقصد کبھی نہیں رہا تھا کہ وہ دوسری ثقافتوں پر اثر ڈال کر ان کی اصلاح کرے" تو یہ کچھ مبہم سا ہے۔ بے شک خلیج فارس سے لے کر جبل الطارق تک کے خطے میں اسلام کا "ردِ عمل" کچھ اور رہا۔ لیکن اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ اِن علاقوں میں عرب مسلمان کافی تعداد میں آباد ہو گئے تھے۔ اور یہ خطہ ثقافتی و لسانی طور پر عرب بن گیا۔ پر جہاں بڑے ملکوں اور بڑی آبادیوں کے ساتھ اسلام کو واسطہ پڑا، وہاں اُس کا "ردِ عمل" یہی تھا جس کا مصنف نے انکار کیا ہے۔ مثال کے طور پر چین، ہندوستان اور یورپ۔

"اسلام کی توسیع" کے باب میں ڈاکٹر صاحب نے بڑی تفصیل سے صوفیہ نیز اسماعیلی مبلغوں کی تبلیغی سرگرمیوں کا ذکر کیا ہے۔ اور ثابت کیا ہے کہ اسلام کی توسیع اسلامی حکومتوں کے جبر یا ترغیب و تحریص کا نتیجہ نہ تھی بلکہ اس کا سہرا زیادہ تر صوفیہ اور دوسرے بزرگوں کے سر ہے۔ یہ باب بڑا معلومات افزا ہے اور خاص کر اسماعیلی مبلغوں کے بارے میں جو معلومات بہم کی گئی ہیں، اُن کا ذکر اب تک ہمارے ہاں بہت کم ہوا ہے۔ تبلیغ اسلام کی آج جو صورتِ حال ہے، اُس کے بارے میں مصنف کا یہ جائزہ قابلِ توجہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



ر......... یہ عمل (قبولِ اسلام کا) برِ عظیم میں سلطنتِ برطانیہ کے قیام سے کمزور پڑ گیا
گر ختم کبھی نہیں ہوا تھا۔ اب اس کی رفتار انتہائی سست ہو گئی ہے۔ کیونکہ صوفی سلسلے جو اس
ِ توجہ مبذول کرتے تھے، اب سرگرم کار نہیں ہیں۔ اسلام کے ساتھ وفاداری نے ایک سیاسی شکل
یکرلی ہے۔ اور تبلیغِ اسلام کے لئے ویسی کوئی شخصیت بروئے کار نہیں آتی، جیسی کہ اُس زمانے میں
تی تھی۔"

نیز یہ کہ

"اسلام کا وہ تفوق اور اس کی وہ دِل کشی اب باقی نہیں رہی جو اس وقت تھی جب کہ وہ نہ صرف
ہیں بلکہ تمام مشرق میں ایک غالب قوت تھا......... اسلام کی سیاسی قوت ہر مقام پر ختم ہو گئی
مسلمان کبھی انسانی ترقی کا ہراول دستے بنے ہوئے تھے اور آج تقریباً اُس کا دنبالہ بن گئے ہیں...."

باب "سالمیتِ ملت کی طرف اقدام" میں ڈاکٹر صاحب نے یہ بتایا ہے کہ کس طرح برِ عظیم کے مختلف
ں میں پھیلی ہوئی چھوٹی چھوٹی آبادیوں نے بتدریج ایک ملت کی شکل اختیار کی، ان کا یہ ارتقاء دو
سے بالکل فطری تھا۔ ایک تو اس لئے کہ اسلام ایک عقیدے کے ساتھ ساتھ ایک معاشرہ بھی تھا۔
ہندو مسلمان ہوتا تھا، اُسے مسلمانوں کی برادری میں لازماً شامل ہونا پڑتا تھا، دوسرے یہ برادریاں اقلیت
تیں اور اُن کے ارد گرد جارحیت پسند غیر مسلم اکثریت ہوتی تھی، جس سے اُن کا تحفظ صرف باہم متحد
نے سے ہی ہو سکتا تھا۔

مصنف کو اس امر کا اعتراف ہے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے ساتھ ساتھ رہنے سے اُن کے درمیان
ن، تعمیر اور موسیقی وغیرہ کے ذریعہ باہمی میل ملاپ کے اسباب بھی پیدا ہوئے، اور (ہندو سرداروں)
ستثنیٰ کر کے مسلمانوں اور مقامی آبادی کے درمیان تعلقات زیادہ دوستانہ ہو گئے۔ اور اس کام میں
فی اور بھگت بڑے مددگار ثابت ہوئے، لیکن اس کے باوجود مصنف کا کہنا ہے کہ مسلمان بدستور
الگ ملت رہے، جس کی ایک جداگانہ ثقافت اور معین اغراض و مقاصد تھے، جو اُسے ہندوؤں
متاز کرتے تھے۔ بے شک اس ملت کا وطن ہندوستان تھا، لیکن اُس کی ثقافت پر اسلام اور
ایشیا کی چھاپ رہی۔

اس میں شک نہیں کہ ملت کی اس انفرادیت کی وجہ اسلام اور اُس کی ثقافت تھی، لیکن جس زمانے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



یہ بات ہے، اُس میں وسط ایشیا کی طرف سے برِعظیم میں برابر انتقال آبادی ہوتا رہتا تھا۔ پھر اُس دور ، وسط ایشیا نہ صرف جسمانی توانائیوں اور ذہنی صلاحیتوں میں بلکہ ثقافتی لحاظ سے بھی تفوق رکھتا تھا، اس لئے ں دَور میں" ہندوستانی مسلم ثقافت" کا" وسط ایشیائی" رہنا قرینِ قیاس تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے بحث میں ں کا ذکر کرنا ضروری نہیں سمجھا۔

باب" ایک پُر خطر فتح" میں مصنف نے اُس" فتح" کو جو اسلام کو ہندو مذہب کو متاثر کرنے اور اُس میں یر اور بابا نانک جیسے بزرگ پیدا کرنے میں حاصل ہوئی، "پُر خطر" بتایا ہے۔ کیونکہ بقول اُن کے اِن کی تعلیمات ے نتیجہ میں برِعظیم کی مسلمان برادری کی عددی ترقی متاثر ہوئی۔ اس میں مسلمانوں کے لئے فخر و مباہات کی کوئی جہ نہیں تھی۔ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں: " برِعظیم کی ملتِ اسلامیہ کی فطرت یہ رہی ہے کہ وہ انضمام کی تمام ِشوں کا مقابلہ کر کے اپنی انفرادیت کو باقی رکھے۔"

یہ سب صحیح، لیکن یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ اسلام اور مسلمانوں کے اثرات کے نتیجہ میں ہندوؤں ں پہلے مذہبی و فکری اور پھر سیاسی بیداری کا پیدا ہونا تاریخی اقتضا تھا۔ اور آخر میں اُن کا آزادی حاصل کرنا ی متوقع تھا، اگر اس طرح کی" فتح" کو بجائے" پُر خطر" سمجھنے کے" خوش آئند" سمجھا جاتا تو کیا بعد کی صدیوں میں اور ب دونوں قوموں کے تعلقات کم ناخوشگوار نہ ہوتے ؟

اسی باب کا آخری پیرایہ ہے: " بھگتی تحریک نے حکم رانوں اور رعایا کے درمیان مصالحت کی قوتوں کو مستحکم ر کے سیاسی اور انتظامی معاملوں میں عظیم خدمت انجام دی ہے۔ فرماں روا اپنی انتہائی سرگرم کوششوں کے ا وجود وہ ہم آہنگی پیدا نہ کر سکتے تھے، جو اِن بزرگوں اور مفکروں نے لوگوں کے دلوں تک پہنچ کر پیدا کی بھگتی ا ثقافتی عطیہ بھی معتدبہ تھا۔ بھگتوں کی شاعرانہ تخلیقات نے مختلف ہندوستانی زبانوں کے ادب کو مالا مال ر دیا ہے۔" کیا اس" فتح" کو پُر خطر کہنا صحیح ہے، ہمارے نزدیک یہ صحیح نہیں۔

اس باب میں کبیر پر کافی لکھا گیا ہے۔ یہ نہ صرف ادبی لحاظ سے بلکہ اپنی معنویت کے اعتبار سے بھی ایک ناہ کار ہے۔ مصنف اور مترجم دونوں کی خدمت میں اس کے لئے جتنا بھی خراجِ تحسین ادا کیا جائے، کم ہوگا۔

باب" دِگر اعتقادی؎ کا دور" میں اکبر کی مذہبی بے راہ رویوں پر بحث ہے۔ مصنف نے یہ تسلیم کیا ہے کہ ہر

---

؎ راسخ الاعتقادی (ORTHODOXY) کے خلاف HETERODOXY کے لئے" دِگر اعتقادی" کی اصطلاح وضع کی گئی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



عقیدے میں دوگرا اعتقادی کا ظہور ہوتا رہتا ہے۔ کیونکہ حق کا فہم ہمیشہ ایک سا نہیں ہو سکتا۔ نیز یہ
دماغ کی پُرشوق و سنجیدہ توجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ دماغ کو جو سوالات پریشان کرتے ہیں، وہ اُن کا
کی کوشش کرتا ہے، اور اپنے خیال میں جو جواب اُسے مل جاتے ہیں، اُن کو بڑے جوش سے اپنے
داخل کر لیتا ہے۔

یہ تو اِکّے دکّے افراد کی بات ہوئی، لیکن جب کوئی دِگرا اعتقادی ایک عمومی مسلک بن جاتی
گروہ اُسے قبول کر لیتا ہے، تو اس کے پیچھے معین سیاسی، معاشی اور گروہی اسباب ہوتے ہیں، جو
دِگرا اعتقادی کی صورت میں نکلنا لازمی ہو جاتا ہے۔ ہمیں تاریخِ اسلام کی دِگرا اعتقادی کو اس نظ
ایران میں شیعہ صفویوں کے عروج، ایرانیوں کے کثیر تعداد میں برِعظیم میں آنے اور پھر علمی و انتظا
کے مالک ہونے کی وجہ سے اُنہیں نظر انداز کرنا ممکن نہ تھا، اس کے ساتھ ہی ہندوؤں کے فوج
تھے۔ جہاں تک افغانوں کا تعلق تھا مغل اُن پر کلی اعتماد نہ کر سکتے تھے۔ باقی رہے ترکمان، ہما
سامنے تھا، ان حالات میں اُسی "سُنّی اسلام" کا مسلکِ حکومت ہونا جس کے ترجمان اُس عہد
تھے، کیسے ممکن تھا۔ اکبر کی نام نہاد مذہبی اُپج اس سیاسی ضرورت کا مظہر تھی۔ اکبر سے پہلے
فرماں رواؤں نے بھی اس قسم کی کوششیں کیں۔ مامون کا اعتزال اور صفوی خاندان کا جو اصلاً
تھا۔ برسرِ اقتدار آنے کے بعد اثنا عشری شیعیت کو اپنانا، اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ مامو
شکست ہوئی۔ کیونکہ ترک فوجی جو عباسی خلافت پر غالب آ گئے تھے، اس قسم کی عقلیہ
خلاف تھے۔ اکبر اپنی مذہبی پالیسی میں اس لئے ناکام ہوا کہ وسط ایشیا سے آنے والے طبقے
کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ اور اُس وقت فیصلہ کن قوت اُن کے ہاتھ میں تھی۔

مصنف نے آگے چل کر ایک جگہ سرسید کی "دِگرا اعتقادی" کا دفاع کرتے ہوئے لک
جانتے تھے کہ نئے علوم کا مسلمانوں کے تفکر پر اثر لازماً گہرا پڑے گا، اس لئے وہ مسلما
حقائق کے موافق بنانے کے لئے خواہش مند تھے۔" اس لئے سید احمد خاں اسلام اور سائنس
تدقیق میں نہ صرف حق بجانب تھے، بلکہ ایک ضرورت کو پورا کر رہے تھے۔ بے شک اس میں
بھی ہوئیں، لیکن اُنہوں نے جو قدم اُٹھایا، اُس سے نئی راہیں کھلیں، اور اسلامی مذہبی فکر
آئی۔ اکبر کے عہد میں ابوالفضل، فیضی اور دوسرے دانش وروں نے جو کچھ کیا، اُسے بھ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



ہے دیکھنا چاہیئے۔"

ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے"...... متعدد چشمے (دگر اعتقادی کے) ایک ہی طرف کو بہہ رہے تھے۔ آخر کار اکبر
ر میں وہ سب جمع ہو کر ایک بہت بڑا دریا بن گئے۔ اکبر کے مذہبی خیالات جو دینِ الٰہی کی شکل میں ظاہر ہوئے
ن ایک شاہی دماغ کی سنک سے متعلق ہوتے تو تاریخی حیثیت سے اُن کی کوئی اہمیت نہ ہوتی۔ مگر وہ اس لیئے
ہ کہ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں جو رجحانات کچھ عرصے سے کارفرما تھے، اُن کا نقطۂ عروج وہی خیالات
۔ یقیناً اکبر اِن رجحانات کو ایک معتدل شکل نہ دے سکا، لیکن جہانگیر اور شاہ جہاں کے عہدوں میں ان میں
ال آگیا تھا، عالمگیر نے تاریخ کے اس عمل کا رُخ ہی بدل دیا، اس سے برِّعظیم کی زندگی کے تضادات میں
شدت پیدا ہو گئی۔

اس ضمن میں فاضل مصنف نے اکبر کے دَور کی "راسخ الاعتقادی" کو اسلام کے مرادف سمجھ کر یہ حکم لگایا ہے:۔
"........ مگر سیاسی حیثیت سے راسخ الاعتقادی کو کاملاً معزول کیا جا چکا تھا اور یہ نہیں معلوم ہوتا
ر وہ پھر کبھی اقتدار پر قبضہ جما سکے گی۔ اور اس سب کی پُشت پر ایک سوال منڈلا رہا تھا: ایسی حالت میں کہ
عتقادی کا اقتدار قائم ہو چکا تھا، غیر مسلموں کی قوت روز بروز بڑھتی جا رہی تھی اور اسلام کے عقائد اور
ی اُصولوں کو تخریب کا خطرہ تھا، کیا مسلم ملت اپنے وجود کو قائم رکھ سکتی تھی"؟

اس کے بعد کا باب ہے "راسخ الاعتقادی کا احیا"۔ اس میں حضرت مجدد الف ثانی پر بحث کی گئی ہے۔
احیا کا جو حشر ہوا، مصنف کے ان الفاظ میں ملاحظہ کیجیئے:۔"...... ابتداءً راسخ الاعتقادی کی تحریک
دل کے خلاف بھی اُتنی ہی شدت سے تھی جتنی کہ غیر مسلموں کے خلاف.......... جس تحریک کا مقصد یہ
مسلمانوں کا اخلاقی احیا کرے اور اُنہیں غیر اسلامی اثرات سے آزاد کرائے وہ شیعیت کے خلاف بھی
ب آزما تھی۔ اس صورتِ حال نے شیعوں کے لیئے یہ امر ناممکن کر دیا کہ وہ سُنیوں کے ساتھ تعاون کریں
اُن کی تحریک کو تحفظِ اسلام کی جدوجہد سمجھیں۔ اس طرح اُمور تنقیح طلب اُلجھ کر رہ گئے اور مسلمانوں کے
ے گھر میں پھوٹ پڑ گئی........ اُن کی سلطنت کے ضیاع اور اُن پر مصائب کے ہجوم کا ایک جزوی
سبب یہ بھی تھا کہ وہ اپنے درمیان کوئی مفاہمت پیدا نہیں کر سکے۔"

یہ تھا اُس دَور کی راسخ الاعتقادی کا المیہ۔ اور یہ کتنا ہولناک المیہ ہے
یہ راسخ الاعتقادی دراصل حنفی فقہ کا ترکستانی "برانڈ" تھا جس میں نہ وسعتِ فکر تھی اور نہ آگے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



دیکھنے والی نظر۔ افسوس شاہ ولی اللہؒ جیسے مفکر بہت بعد میں پیدا ہوئے، جب کہ سیاسی اقتدار کا زوال شروع ہو گیا تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے حضرت شاہ ولی اللہؒ اور اُن کے متبعین کی تجدیدی و اصلاحی جدوجہد کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ یہ کتاب کے بہترین ابواب میں سے ہے۔ اور فاضل مصنف نے اس میں بڑی ہی دقتِ نظر سے کام لیا ہے۔ وہ شاہ صاحب کی شخصیت و دعوت کا جائزہ ان الفاظ میں لیتے ہیں:۔

"دوسرے مُسلم مفکرین کی طرح شاہ ولی اللہ کا عقیدہ بھی اسلام کی ہمہ گیر نوعیت پر تھا۔ وہ ایک طرف عمرانیات، سیاسیات اور معاشیات کے اُصولوں اور دوسری طرف اسلام کی اخلاقی تعلیمات کے درمیان حدِ فاصل نہیں کھینچتے تھے۔ وہ یہ خیال نہیں کرتے تھے کہ اسلام کے اخلاقی پسِ منظر کے بغیر عمرانیات، معاشیات اور سیاسیات کے ذریعہ انسانی زندگی کا بلند ترین مقصد حاصل کرنا ممکن ہے۔ اُن کی نظر میں ایک اچھے اور مفید معاشرے کا حصول اسلام کی اخلاقی اور روحانی قدروں پر زور دیئے بغیر ممکن نہیں تھا۔ اسی طرح یہ بھی دشوار تھا کہ بغیر ایک صحت مند معاشرے کی حمایت کے اسلام پر پوری طرح عمل کیا جائے اور جو امکانات اُس کے اندر موجود ہیں، اُن کے نشو ونما کو درجۂ کمال تک پہنچایا جا سکے۔"

شاہ ولی اللہ کی دعوت بارآور نہ ہو سکی اور اُن کی اور اُن کے متبعین کی کوششیں ملت کے زوال کو روک نہ سکیں۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کے الفاظ میں:۔

"اُنھوں نے قوم کے اندر ایسی اُمنگیں پیدا کر دیں جنھوں نے اسے اس قابل بنا دیا کہ وہ اپنے اخلاقی ذوق وشوق میں سے کچھ دوبارہ واپس لے لے اور اپنے عقائد کی پاکی کو باقی رکھ سکے۔ قوم کے ضمیر، اُس کے عقائد اور اس کے اخلاقی مقصد یہ اُس کے ایقان کو اٹھارھویں صدی کے ملبے میں سے باہر نکال لینا بذاتِ خود کوئی معمولی کارنامہ نہیں تھا، مگر شاہ ولی اللہ نے اس سے بھی زیادہ کامیابی حاصل کی۔ اپنی تصانیف کے ذریعہ اُنھوں نے مُسلم فکر کے بہت سے میدانوں میں بڑے دیرپا اضافے کئے۔"

بعد کے ابواب میں سید احمد شہیدؒ اور اُن کے ساتھیوں کی جدوجہد اور آخر میں سکھوں کے ہاتھوں شکست، پھر ۱۸۵۷ء کا سانحہ اور اُس کے تباہ کُن نتائج کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ باب جس کا عنوان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



"پندارِ شکستہ کی انتہائی پستیاں" سے بیان الفاظ پر ختم ہوتا ہے:۔

"ہنٹر ۱۸۷۱ء میں مسلمانوں کے متعلق لکھتا ہے:۔ وہ اب بھی تھوڑے تھوڑے وقفوں
قومیت کے متعلق اپنے پرانے شدید جذبے اور سپاہیانہ مہم کی صلاحیت و قابلیت کا مظا
ہیں مگر دوسرے اور تمام اعتبارات سے وہ ایک ایسی قوم ہیں جو برطانوی حکومت کے ما
ہو چکی ہے"۔

"نئی راہیں" ۔ "ایثار کی اولوالعزمی" ۔ اور "مسلم قومیت کا ظہور" عنوانات کے ابواب میں
سے لے کر ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء تک کی سرگزشت ہے۔ فاضل مصنف کے الفاظ میں "جب
معرضِ وجود میں آیا تو برعظیم کی مسلم ملت کی جگہ پاکستانی قوم اور اس مسلم اقلیت نے لے لی، جو اب
میں رہتی ہے"۔

یہ کتاب جیسا کہ شروع میں عرض کیا گیا۔ ایک خاص نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے، اس نقطۂ نظر
دو رائیں ہو سکتی ہیں اور مصنف سے اُن کے بعض نتائج کے متعلق اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے۔
تک اس کتاب کے مافیہ اور اسے نہایت اعلیٰ علمی و ادبی پیرائے میں بیان کرنے کا تعلق ہے،
پر ہمارے ہاں یہ اپنی قسم کی پہلی کتاب ہے۔ مصنف کی طرح مترجم نے بھی پوری کوشش کی ہے کہ
اُسی بلند معیار کا ہو، جیسی کہ اصل کتاب ہے۔ اور اس میں وہ ہر لحاظ سے کامیاب ہوتے ہیں۔

کتاب ٹائپ میں چھپی ہے، اور نہایت صحیح چھپی ہے۔ آخر میں اشاریہ، کتابیات اور اہم واقعا
تاریخ درج ہے۔

ضخامت ۴۲۸ صفحات، بڑا سائز،

قیمت (اخباری کاغذ) ۱۸ روپے،

——— (م۔ س)

© rasailojaraid.com